ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر آمنہ بتول
صدرِ شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج فار ویمن، سرگودھا
ڈاکٹر سائرہ ارشاد
لیکچرر شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاولپور
سید ازور عباس
لیکچرر شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

اُردو ناول میں لاہور کی ثقافت: ایک مطالعہ

Dr. Amna Batool
Head Deptt of Urdu, Govt Post Graduate College for Women, Sargodha.
Dr .Saira Irshad
Lecturer, Deptt of Urdu 'Govt Sadiq College Women University Bahawalpur.
Syed Azwar Abbas
Lecturer, Deptt of Urdu, Hazara University, Mansehra.

The Culture of Lahore in Urdu Novel: A Research Study

There is major difference of culture in urban and rural life of Punjab During analysis, it reveals that this difference in culture exists in past and present. Most of the novel writers focused only Lahore in their novels and other urban areas were symoblized through the major city. Historical importance of gates, bazars buildings, roads and gardens of Lahore city apparently seen in biage analysis of urban culture.

Keywords: *culture, Punjab, Lahore, Novel, Data Darbar, Shalimar Bagh.*

پاکستانی اُردو ناول میں شہری زندگی کے پس منظر میں سب سے زیادہ ذکر "لاہور" کا آیا ہے جو پنجاب کا مرکزی شہر اور دارالحکومت ہے۔ پنجاب کی شہری زندگی کی جتنی رنگارنگ تصویر ہمیں لاہور میں نظر آتی ہے اتنی کسی دوسرے شہر میں ملنا مشکل ہے۔ غلام ثقلین نقوی نے "میرا گاؤں" میں سیالکوٹ شہر جبکہ محمد الیاس نے اپنے

ناولوں میں اسلام آباد اور راولپنڈی کی شہری زندگی کو موضوع بنایا ہے لیکن اکثر ناولوں میں ہمیں "لاہور" کا کلچر ملتا ہے۔ اکثر ناول نگاروں نے لاہور کے گلی کوچوں، اس کے دروازوں، بازاروں اور اہم تاریخی عمارات کا تعارف اور ان کی رنگارنگی کو ناول کے مجموعی رنگ میں اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ لاہور کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

لاہور کی سرگزشت اتنی ہی قدیم ہے جتنا یہ شہر۔ گویا لاہور کا نام آتے ہی طلسم واسرار کی الف لیلہ کا ایک باب کھل جاتا ہے۔ لاہور محض ایک شہر نہیں ہے یہ ایک کیفیت ہے۔ یہ کیفیت جب اس شہر کی نیم روشن گلیوں، اس کے پرانے تاریخی باغوں میں چلنے پھرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتی ہے تو پھر انسان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شہر سے اس کی روح کا رشتہ بہت پرانا اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ہے۔ اس قدیم شہر میں کئی تہذیبیں اپنی شان و شوکت کے ساتھ رہیں پھر صدیوں بعد نئی تہذیبوں کی یلغار کے سامنے دم توڑ کر مٹ گئیں، شہر آباد ہوتا رہا شہر مٹتا رہا لاہور روشن ہوتا رہا، لاہور اندھیرے میں ڈوبتا رہا مگر ان حوادث کے باوجود اس شہر کی عالی و قاری آج تک قائم دائم ہے۔ اس کی رونقوں میں فرق نہیں آیا۔ اس کے در، دروازے اسی طرح آباد ہیں اور انہی در و دیوار کی کہانیاں ہمیں ناولوں کی تحریروں میں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

لاہور کو داتا کی نگری کہا جاتا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ ہر شہر کا کوئی نہ کوئی پیر یا ولی ہوتا ہے جو شہر اور اس کے رہائشیوں کو آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگرچہ لاہور میں ولیوں صوفیوں کے بہت سے مقابر ہیں اور ہر مقبرے کے ساتھ عقیدت مندوں کا کوئی نہ کوئی روحانی یا صوفیانہ سلسلہ بھی وابستہ ہے لیکن علی ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخشؒ کو صحیح معنوں میں پیروں کا پیر یا لاہور کا پیر کہا جاسکتا ہے۔ لوگوں کی عقیدت یہاں کی روحانی اور ثقافتی زندگی کا اہم عنصر ہے۔

> جب اس شہر میں آیا تو سیدھا داتا دربار کے مزار پر گیا کہ یہ داتا کی نگری ہے اور ان سے مدد کا سوالی ہوا۔۔۔ انھوں نے میری سن لی اور میرے کام میں برکت پڑ گئی۔"(۱)

لاہور کے باسی اس کہاوت پر بہت فخر محسوس کرتے ہیں جو لاہور کے بارے میں صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ لاہور کے کلچر، رہن سہن، طور اطوار کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی حد تک سچ معلوم ہوتی ہے کیونکہ جو رنگارنگی اور خوبصورتی لاہور میں ہے وہ صرف اس کا ہی خاصا ہے۔ ذیل میں ہم لاہور کے دروازوں، تاریخی عمارات، بازار اور مختلف مقامات کو بیان کریں گے جن کا ذکر ہمارے ناول نگاروں نے

اپنے اپنے ناولوں میں اس طرح سے کیا ہے کہ ایک طرف وہ ناول کے پلاٹ کی ضرورت محسوس ہوتے ہیں تو دوسری جانب قاری کے لیے معلومات کا ایک وافر ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔

قدیم لاہور کی تاریخ کے مطابق مغلوں کی آمد کی وجہ سے پہلے لاہور کے ارد گرد کوئی بلند فصیل موجود نہیں تھی یہ ایک کھلا شہر تھا اس پر کسی ایک بادشاہ یا راجہ کی حکومت نہیں رہی تھی کہ اسے شہر کے گرد چار دیواری بنانے کی مہلت ملتی اور چار دیواری کی تعمیر ایک عظیم منصوبہ تھا جس کی مالی کفالت چھوٹے چھوٹے صوبیداروں یا معمولی راجاؤں کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا جب مغل آئے تو انھوں نے یہ منصوبہ بنایا۔ اس بارے میں انیس ناگی اپنی کتاب "لاہور جو شہر تھا" میں لکھتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت میں اکبر بادشاہ نے سب سے زیادہ دیر تک لاہور میں قیام کیا۔ وہ کم و بیش چودہ برس اس شہر میں مقیم رہا چنانچہ اپنے قیام کے دوران اس نے ایک طرف تو قلعہ لاہور کی خشت بندی کا کام شروع کروایا تو دوسری طرف لاہور کے گرد پختہ فصیل تعمیر کی۔ کہا جاتا ہے یہ فصیل بہت دبیز اور بہت طویل تھی اور اس کے ایک دروازے سے دوسرے کے درمیان ۱۰ پہرہ دار متعین تھے۔ لاہور کی فصیل میں کل بارہ دروازے تھے اور تیرھواں دروازہ جسے روشنائی دروازہ کہا جاتا تھا یہ قلعے کی جانب جنوب سے شہر جانے کا راستہ تھا۔[۲]

دیگر بارہ دروازوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ یکی دروازہ	۲۔ قادری دروازہ	۳۔ دہلی دروازہ	۴۔ اکبر دروازہ
۵۔ موچی دروازہ	۶۔ شاہ عالمی دروازہ	۷۔ بھاٹی دروازہ	۸۔ کشمیری دروازہ
۹۔ موری دروازہ	۱۰۔ گلگھڑ دروازہ	۱۱۔ کشمیری دروازہ	۱۲۔ لوہاری دروازہ

قیام پاکستان کے بعد چونکہ دروازوں اور فصیلوں کی دفاعی نقطہ نظر سے ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اب یہ فصیلیں ٹوٹ پھوٹ کی نذر ہو گئی ہیں۔ یکی دروازہ، مستی دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، ٹکسالی دروازہ اب بڑی سڑکوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

دروازے کے اندر موجود دکانوں، گھروں کی تعمیر، رہن سہن، کھانے، لباس اور طرز زندگی کی خوبصورت تصویر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ناول نگاروں نے ناولوں میں اندرونِ لاہور کے کلچر کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے اور اس کے رنگ اتنے گہرے ہیں جو ماہ و ایام کی تہہ میں نہ دب سکتے ہیں نہ پھیکے پڑ سکتے ہیں اور نہ ہی بکھر سکتے ہیں۔

اُردو ناولوں میں سب سے تفصیلی ذکر لاہوری دروازے کا آیا ہے جبکہ مختصراً موچی دروازہ اور بھاٹی دروازہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ لاہوری دروازہ لاہور شہر کے نام سے منسوب ہے۔ اس دروازے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں جب ہندو راجاؤں کو محمود غزنوی کے ہاتھوں شکست ملی تو اس کے نائب ایاز نے لاہور کی تعمیر نو کا کام شروع کروایا اور سب سے پہلے اس نے لوہاری کے علاقے کو آباد کرنا شروع کیا تھا۔ لوہاری دروازے کا مخصوص کلچر ہے۔ یہاں کے باسیوں کا اپنا طرزِ زندگی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں میں لوہاری دروازہ کے کلچر کی بہت خوبصورت تصویر کشی کی ہے جن سے ہمیں اس علاقے کی دکانوں، مکانات، کھانوں، لباس اور مساجد کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اے غزالِ شب، میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> "بالآخر جب میں لوہاری دروازے کے نواح میں پہنچا تو اس کے داخلے پر سربلند مسلم مسجد سے صبح کی نماز کی اذان بلند ہو رہی تھی۔.... پھولوں والے کھوکھوں کے آگے دیسی گلاب اور گیندے کی ٹوکریاں اتر رہی تھیں.... دروازے کے باہر بند دوکانوں کے آگے چوڑے فٹ پاتھ پر اوپن ایئر ریستوران کھلے تھے۔"(۳)

لاہوریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کھانے کے لیے زندہ رہتے ہیں لہٰذا انتہائی خوش خوراک واقع ہوئے ہیں۔ لاہوریوں کے کھانے اور کھانا پورے پاکستان میں مشہور ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔

> "مرغ چنے.... سری پائے.... نہاری اور حلیم کے دیگچے چڑھے تھے.... گلی میں حاجی نہاری کی دوکان کے باہر برتنوں، پیالوں، بالٹیوں، تانبے کی پلیٹوں اور پلاسٹک کے ڈبوں کی ایک قطار اور وہ بھی منتظر لگی ہوئی تھی کہ کب ان میں حسب استطاعت نہاری کے گھنے شوربے انڈیلے جائیں۔"(۴)

لاہور کے ان قدیمی دروازے کے اندر کا طرزِ تعمیر موجودہ طرزِ تعمیر سے بہت مختلف ہے۔ مکانات چھوٹے چھوٹے اور بلند و بالا ہیں جو قدرے تاریک ہوتے ہیں گلیاں اس قدر تنگ کہ ایک وقت پر دو افراد اکٹھے بامشکل گزر پاتے ہیں۔ گھروں کے یہ حالات کہ اینٹیں اکھڑی ہوئی ہیں اور چھتیں اس قدر شکستہ کہ ہر لمحہ ان کے گرنے کا خوف موجود رہتا ہے۔ مستنصر نے کھانوں کے ساتھ ساتھ اندرون لاہور کی اس طرز تعمیر پر بھی روشنی ڈالی ہے گویا ان کے ناولوں نے لاہور کے قدیم طرز تعمیر کو اپنے اندر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

"ایک تنگ گلی.... ایک دوسرے کا سہارا لیتے مشرقی قدامت میں گم، اداسی اور وقت کی پہنائیوں میں ڈوبے ہوئے مکان.... شکستہ جھروکے جن کی چھتوں کی گولائی میں سے اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور دھوپ ان شگافوں میں سے تاریک گھروں کے اندر سرائت کرنے کی کوشش میں دم توڑ جاتی تھی۔"(۵)

لاہور فنونَ لطیفہ کے حوالے سے ایک اہم مرکز ہے فن کو سیکھنے اور اس کو پیش کرنے کے مواقع لاہور میں میسر ہیں جہاں تک فنِ موسیقی کا تعلق ہے تو ابتدائی ایام ہی سے لاہور مرکز رہا ہے۔ لکھنو، دلی سے آنے والے زیادہ تر خاندانی موسیقار لاہور آکر ہی آباد ہوئے اور خاص طور پر اندرون لاہور میں۔ اگرچہ وقت اور حالات نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں اصل موسیقی جس کو کلاسیکی موسیقی کہتے ہیں نوجوان نسل میں اس کی جانب رجحان بہت کم ہو گیا ہے اور خاص طور پر جب سے پاپ موسیقی نے اپنے قدم جمانے شروع کیے ہیں۔ لوگوں کا رجحان اور دلچسپی کلاسیکی موسیقی کی طرف نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے لیکن اس کے باوجود بھی کئی کلاسیکی موسیقی کے نمائندہ خاندان ابھی بھی ان علاقوں میں رہائش رکھے ہوئے ہیں جن کی طرف اشارہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول راکھ میں بھی کیا ہے

"گال پھلائے کلیرنٹ پھونکتا کوئی مونچھوں والا استاد اور یہ تصویر اتنی پرانی تھی کہ استاد کی سفید مونچھیں بھوری ہو کر سیاہ ہونے کو تھیں چند اخباری تراشے.... امانت علی خان، مہدی حسن.... استاد شریف خان پونچھ والے .... بڑے غلام علی خان.... استاد برکت علی خان،"(۶)

موچی دروازہ جس کا اصل نام موتی دروازہ تھا لیکن بگڑ کے یہ نام موتی سے موچی ہو گیا۔ موتی اکبر کا ملازم تھا اور یہ دروازہ اس کے نام سے منسوب تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے موچی دروازے کا ذکر اپنے ناول میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

"اس زمانے میں مشاہد موچی دروازے کی گھاٹی سے اترتے گوالمنڈی چوک سے زرا ادھر ایک مکان میں رہتا تھا وہ کیا اس کے والدین اور بہن بھائی رہتے تھے جس کی بلند چھت پر شہر بھر کی پتنگیں اور گڈے اڑا کرتے تھے اور شاہ عالمی کی آگ سے جنم لینے والے راکھ پرندے گرتے تھے۔"(۷)

دلی دروازے کا نام اس لیے دلی رکھا گیا کیونکہ اس دروازے کے قریب سے دہلی جانے کا راستہ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تک حجاموں کی زیادہ تر دکانیں دلی دروازے کے واقع تھیں جن کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے خس و خاشاک زمانے میں بھی کیا ہے۔

"وہ لنڈے بازار سے نکل کر کوتوالی کی جانب سے ہوتا ہوا دلی دروازے میں داخل ہوا اور اس نے اندرونِ شہر کے ہر حجام کے بہتیرے ترلے کیے، منت سماجت کی پر یوں لگتا تھا کہ وہ گاہکوں کی داڑھیاں تھوکیں لگا کر مونڈھتے ہیں۔"(۸)

بھاٹی دروازہ بھی قدیم شہر کی جانب جنوب کی طرف کھلتا ہے۔ اس دروازے کا نام بھاٹی اس مناسبت سے ہے کہ یہاں کسی زمانے میں بھاٹ (بھٹی) قوم کثرت سے آباد تھی چنانچہ بھٹی کی نسبت سے اس کا نام بھاٹی دروازہ پڑ گیا۔ خس و خاشاک زمانے میں مستنصر بھاٹی دروازے کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔

"سائیں ٹلی کے چنڈوخانے میں بھاٹی دروازے کے باہر وہاں ہی ہوتا ہے جب نشئی نہیں ہوا تھا تو پورے لاہور کے نائی اس سے ہی صابن خریدتے تھے۔"(۹)

لاہور اپنی تاریخی عمارات کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ کئی قدیم مساجد لاہور کی شان بڑھا رہی ہیں جن میں سب سے تفصیلی ذکر بادشاہی مسجد کا ہے۔ دیگر مساجد میں جن مساجد کا ذکر ملتا ہے اُن میں سنہری مسجد، نیلے گنبد والی مسجد، مسلم مسجد، مسجد مائی لاڈو، مسجد وزیر خان اور مسجد موراں شامل ہیں۔

لاہور کی بادشاہی مسجد کافی عرصے تک دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہلواتی رہی ہے۔ اس مسجد میں بیک وقت پچاس ہزار سے زیادہ لوگ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ بادشاہی مسجد اورنگ زیب نے ۱۶۷۳ء میں ۶ لاکھ سے زائد لاگت پر تعمیر کروائی تھی۔ مسجد کے دروازے پر اورنگ زیب کا نام بھی کندہ ہے اور اس کے ساتھ خدائی خان کا نام بھی نقش ہے جس کے زیر نگرانی دس سال کے طویل عرصے میں یہ مسجد اپنے تکمیلی مراحل کو پہنچی تھی۔

"صفر سے ایک تک" میں عبید اللہ بیگ نے بھی بادشاہی مسجد کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے۔

"بادشاہی مسجد میں پچپن ہزار عبادت گزار بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں مغل شہنشاہ اورنگزیب نے یہ مسجد ۱۶۷۴ء میں تعمیر کرائی۔ طرز تعمیر اور ڈیزائن دہلی کی جامع مسجد سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا استعمال بے تحاشہ کیا گیا ہے۔"(۱۰)

شاہی قلعے کی بنیاد بادشاہ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں رکھی یہ ۱۲۰/ایکٹر پر پھیلا ہوا قلعہ ہے۔ ۱۵۵۲ء سے ۱۶۰۵ء تک اس کی تعمیر کی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کئی تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔ اس میں کل ۱۳ دروازے ہیں۔ قلعے میں واقع شیش محل اس دور کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ " صفر سے ایک تک " میں عبید اللہ بیگ نے بادشاہی مسجد کے ساتھ ساتھ شاہی قلعہ کا تعارف بھی کروایا ہے جس سے قلعہ کے بارے میں مکمل معلومات قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔

> "لاہور کے شاہی قلعے کی لمبائی ۱۴۰۰ فٹ اور چوڑائی ۱۱۱۵ فٹ ہے ۱۹۸۱ء میں شاہی قلعے کو یونیسکو نے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ دیوان عام، دیوانِ خاص، عالمگیری دروازہ، شیش محل نو لکھا محل۔"(۱۱)

شالامار باغ لاہور میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بہت مقبول ہے ہزاروں لوگ ہر روز ہر موسم میں اس کی سیر کو آتے ہیں۔ شاہ جہاں نے اسے ۱۰۴۷ھ میں تعمیر کیا تھا اس عمارت کی وضع قطع ایسی ہیں کہ اس جیسی کوئی اور عمارت پورے ہندوستان میں نہیں ہے۔ "شہر بے مثال" میں بانو قدسیہ شالیمار باغ کی دلکشی و خوبصورتی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ باغ سے متعلقہ معلومات بھی فراہم کرتی چلی گئی ہیں۔ باغ کس نے تعمیر کروایا اور اس کو تعمیر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ نیز باغ کس انجینئر کی نگرانی میں تعمیر کیا گیا یہ معلومات یقیناً دلچسپ بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی۔

شالیمار باغ شاہ جہاں کے خواب کی تعبیر تھی اس بارے میں بانو قدسیہ لکھتی ہیں۔

> "کہتے ہیں کہ ایک دن شاہ جہاں اپنے باپ کے مقبرے پر شب باش ہوا۔ ساری رات باغ دلکش میں آرام سے گزری۔ صبح کے وقت کیا دیکھتا ہے کہ ایک ایسا باغیچہ نگاہوں کے سامنے ہے جس میں پانی اوپر والے درجے سے ہو کر درجہ نشیب کو جاتا ہے اور وہاں سے ہو کر پھر نیچے کو بڑھتا ہے خواب میں کسی نے کہا یہ باغ ارم ہے جب آنکھ کھلی تو ارم کو زمین پر بنانے کا ارادہ کیا اور کامیاب ہوا۔"(۱۲)

شالیمار باغ کا خواب تو شاہ جہاں نے دیکھا لیکن اس باغ کو عملی روپ علی مردان نے دیا جو کہ اس زمانے کا بہت مشہور انجینئر تھا اور اپنے کام کی وجہ سے تمام علاقے میں اس کا ثانی کوئی نہ تھا۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

"علی مردان خان زندہ نہ ہوتا تو شاہ جہاں کے سارے خواب طاق میں دھرے رہتے ویسا صاحب کمال صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے، نہروں کا وہ سلسلہ چلایا کہ ہند کے ریگ زار کو لہلہاتا سبزہ بنا دیا۔"(۱۳)

چوبرجی جس کے پہلے صرف تین برج ہی ہوا کرتے تھے اب اس کا چوتھا بُرج بھی تعمیر کر دیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول "شہر بے مثال" میں چوبُرجی کی تاریخ کچھ یوں بیان کی ہے۔ لکھتی ہیں کہ حال اس عمارت کا یوں بیان کرتے ہیں کہ عالمگیر کی چہیتی بیٹی زیب النساء تخلص جس کا مخفی تھا اور جو صاحب دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و خوبی میں یکتا تھی چوبُرجی کو اِسی شہزادی نے معرفت حیابائی دایہ نے خود تعمیر کرایا تھا۔ حیابائی نے کہ خواص نہایت قابلہ، منظور نظر، محرم راز زیب النساء تھی۔ بڑی محنت اور لگن سے یہ باغ اپنی نگرانی میں مکمل کروایا اس لیے اس جگہ کا نام باغ حیادایہ مشتہر ہوا۔ جب کہ ایک روز زیب النساء یہ باغ دیکھنے چلی تو راستے میں سنا کہ چند اشخاص آپس میں اس باغ کو میابائی کا باغ کہہ رہے ہیں۔ دل رنجیدہ ہوا کہ جس باغ کے توسط سے ناموری حاصل کرنے کی آرزو تھی سو پہلے ہی کسی کے لیے نامزد ہو چکا ہے۔ اب یہی مناسب سمجھا کہ جو کوئی اس باغ پر مجھ کو دُعائے عافیت دے باغ اسی کو عطا کر دوں جب شہزادی چوبرجی کے دروازہ کلاں پر پہنچی تو اتفاقاً میابائی نے کورنش بجا کر دُعائے عافیت دی۔ شہزادی عالی وقار نے باغ مذکورہ میابائی کو عطا کیا اور باغ دیکھے بغیر قلعے کو اس راہ سے روانہ ہو گئیں جہاں پہلے افسران والی شان کی کوٹھیاں تھیں۔ ۱۴

اے حمید "لاہور کی یادیں" میں لکھتے ہیں

"یہ واقعہ کہ زیب النساء نے باغ تعمیر کروا کر اپنی کنیز حیابائی کے سپرد کیا تھا من گھڑت ہے کیونکہ جب یہ باغ تعمیر ہو رہا تھا اس وقت زیب النساء کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ ایک کمسن بچی خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہو رفاہِ عامہ سے اس قدر دلچسپی لینے کا خیال نہیں آسکتا۔"(۱۵)

بابر بادشاہ نے اپنے بیٹے کامران کو جب لاہور کا گورنر مقرر کیا تو کامران نے لاہور میں آتے ہی باغ راوی کے کنارے ایک باغ کے تعمیر کرنے کا حکم دیا جس طرح اس کے باپ ظہیر الدین بابر نے دریائے جمنا کے کنارے آگرہ میں بنوایا تھا۔ بابر جب پہلی مرتبہ لاہور آیا تو اس نے اسی باغ میں قیام فرمایا تھا۔ باغ کے قریب کامران نے جو عمارتیں بنوائیں تھیں ان میں سے ایک بارہ دری بالکل دریا راوی کے کنارے پر تھی جسے نہایت وثوق کے ساتھ مغل

عہد کی پہلی عمارت کہا جاسکتا ہے لیکن اب ہم اس عمارت سے محروم ہو چکے ہیں کیونکہ دریائے راوی کے وقتاً فوقتاً طغیانی نے اسے نقصان پہنچایا اور اس کی حفاظت کا کوئی کماحقہ انتظام نہ کیا گیا۔ پاکستان بننے سے پہلے تک اس کے آثار موجود تھے لیکن جب پاکستان بنا تو اس سے بالکل بے اعتنائی برتی گئی جس کی وجہ سے ہم اپنے اہم ثقافتی ورثے سے محروم ہو گئے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "خس و خاشاک زمانے" میں پاکستان بننے سے پہلے کے دور کی جہاں عکاسی کی ہے وہاں کامران کی بارہ دری کا بھی تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> "بہت بعد جب ثناءاللہ سے اس نے اس پر فسوں عمارت کا ذکر کیا تھا تو اس نے بتایا کہ راوی کے کناروں پر یہ کامران کی بارہ دری ہے جس کے مغل عہد کے باغ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی من موہنی مہارانی موراں کے ساتھ خمار آلود شامیں گزارتا تھا۔"(۱۶)

لال حویلی عنایت علی نے ۱۹۴۰ء میں تعمیر کروائی مقامی روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ حویلی کشمیر کے مہاراجہ نے اپنی ایک رقاصہ جس کا نام دارو تھا کے لیے تعمیر کروائی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول راکھ میں لال حویلی کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "لال حویلی کی چار منزلہ عمارت لوہاری منڈی بازار جو کہ پیر ھولا سٹریٹ کے شمال میں پڑتا ہے واقع ہے۔ ۱۹۴۰ء میں عنایت علی ولد میراں بخش اس کا مالک تھا۔ ۱۹۸۰ء میں یہ سہیل اکرم، ممتاز بیگم، ایم سعید اور ایم صدیق کی جائداد بن گئی مقامی روایت یہ ہے کہ یہ حویلی مہاراجہ کشمیر نے اپنی ایک رقاصہ دارو کے لیے تعمیر کی تھی۔ تاریخ تعمیر انیسویں صدی کے آخر میں بتائی جاتی ہے۔ حوالہ پراپرٹی نمبر ۷۴۹/D کا اختتام ہوا ہے۔"(۱۷)

مینار پاکستان کو ٹاور پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ مینار پاکستان اس تاریخی جگہ پر ہے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا یادگار جلسہ منعقد کیا تھا۔ مینار پاکستان کو لاہور میں یادگار کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۱/اپریل ۱۹۶۲ء کو حکومت نے ایک روسی نژاد آرکیٹک نصر الدین مرات کے ڈیزائن کردہ مینار کو اس "یادگار" کے لیے منظور کیا اور یوں اس تاریخی مینار کی باضابطہ تعمیر کا آغاز ہوا جو ۲۶/ جولائی ۱۹۶۷ء کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔ مینار پاکستان کی ڈیزائننگ میں بڑی تکنیکی مہارت سموئی گئی ہے اور کچھ اس قسم کا ساز و سامان استعمال کیا گیا ہے جس

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

سے پاکستان کے ابتدائی دور میں پیش آنے والی مشکلات کی عکاسی ہوتی ہے۔ راکھ میں مستنصر حسین تارڑ مینار پاکستان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اور تاریخ آپ کے سامنے ہے بلکہ آپ کے دائیں ہاتھ پر ہے۔ مینار پاکستان کی صورت میں ۔ایسے ایسے باکمال دانشور اور فلسفی اسی مینار کی تعمیر میں ملوث ہوئے کہ کیا عرض کروں اور انھوں نے بہت عرصے تک یادگار پاکستان کا نام دیئے رکھا۔"(۱۸)

ناول نگاروں نے ناول میں لاہور کی مختلف سڑکوں اور بازاروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جن میں قصوری روڈ، گلبرک روڈ، مال روڈ، میکلورڈ روڈ، ایگل چوک، وغیرہ شامل ہیں اور جن بازاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ انارکلی بازار کا تذکرہ ملتا ہے۔ انارکلی بازار کا قیام ان میں دکانداروں کا رویہ، مختلف دکانوں کی تفصیلات انارکلی بازار کی اہمیت وغیرہ پر بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

انارکلی بازار لاہور کا سب سے قدیم اور اہم بازار ہے۔ اسے جنوبی ایشیا کا بھی قدیم ترین بازار کہا جاتا ہے۔ اس کا نام اکبر بادشاہ کی کنیز کے نام پر رکھا گیا۔ پہلے انارکلی بازار ایک ہی حصہ پر مشتمل تھا لیکن اب یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے ایک پرانی انارکلی اور دوسرا نئی انارکلی۔ پرانی انارکلی میں اب روایتی کھانے بنتے ہیں جب کہ نئی انارکلی میں مختلف نوعیت کے سامان پر مبنی دوکانیں موجود ہیں۔ جس طرح لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا اب اس میں ایک جملے کا مزید اضافہ ہو گیا ہے کہ جس نے لاہور آکر انارکلی کی سیر نہیں کی اس نے لاہور ہی نہیں دیکھا اس کا ذکر ہمیں "خس و خاشاک زمانے" میں بھی ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> " یہ کہاوت تو صدیوں سے چلی آتی تھی کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا لیکن اس میں ایک اضافہ ہو گیا کہ جس نے لاہور آکر انارکلی کی سیر نہیں کی اس نے لاہور نہیں دیکھا..... یعنی وہ پیدا ہونے سے بھی رہ گیا۔"(۱۹)

قیام پاکستان کے بعد لاہور کا ریلوے اسٹیشن واحد اسٹیشن تھا جو پاکستان کے تمام شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتا اور پھر آہستہ آہستہ یہاں سے لائنوں کا ایک وسیع جال پورے ملک میں پھیلتا گیا اور اب ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ریلوے کا نظام موجود ہے لیکن اس کے باوجود بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

اور جتنی رونق اس اسٹیشن پر نظر آتی ہے وہ کسی اور جگہ ملنا مشکل ہے۔ جدید ذرائع آمدورفت کے باوجود بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کی اہمیت کسی طور پر کم نہیں ہوئی۔ بانو قدسیہ "شہر بے مثال" میں اس کی تصویر کشی یوں کرتی ہیں۔

> "جس وقت گاڑی پلیٹ فارم پر رکی اور رشیدہ نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا لاہور کی پہلی جھلک شہر کی گرج بن کر خیر مقدم کو آئی بہاولپور میں چھوٹے سے سٹیشن پر نہ کوئی لاؤڈ سپیکر تھے نہ ہی ان میں سے نسوانی آوازیں پھوٹ پھوٹ کر ٹرینوں کی آمدورفت کا پتہ دیتی تھیں۔"(۲۰)

نہر لاہور مغل عہد میں بنائی گئی۔ ۱۸۶۱ء میں انگریزوں نے اسے مزید وسعت دی۔ اس کی لمبائی ۵۱ میل ۸۲ کلو میٹر ہے۔ یہ کھاریاں گاؤں سے شروع ہو کر رائے ونڈ روڈ پر ختم ہوتی ہے۔ لاہور کی شہری زندگی میں یہ نہر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خوبصورتی کے ساتھ غریب لوگوں کی تفریح کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

" اے غزال شب" میں مستنصر حسین تارڑ نہر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شہر لاہور کے دل میں ہولے ہولے بہنے والی مٹیالی اور اکلوتی اُداس نہر.... کہ جس کے ٹھنڈے پانیوں کی سست روانی میں نہ صرف ان بھینسوں کا گوبر بہتا تھا جنھیں اس میں نہلایا جاتا تھا۔ نہ صرف گھوڑوں کے بے دریغ پیشاب سے پانیوں کی رنگت زد ہوتی تھی بلکہ متعدد نئی آبادیوں کی غلاظت بھی اس میں شامل ہو کر اسے ہولے ہولے بہنے پر مجبور کرتی تھی یہ وہ ندیانہ تھی جو صرف اس لیے دھیرے بہتی تھی کہ کسی سیاہ نے اس کے پار اُترنا تھا اس کے باوجود اس کناروں پر بلند ہوتے پیپل، سفیدے اور سنبل کے درخت اور اس کے پانیوں میں اپنے باریک پتے ڈبوتے بید مجنوں یوں سایہ دار ہوتے تھے کہ اہل لاہور شدید گرمیوں میں اس میں ایک آدھ ڈبکی لگانے سے پرہیز نہ کرتے تھے۔"(۲۱)

ہیرا منڈی کو ڈائمنڈ مارکیٹ، شاہی محلہ بازار حسن، ریڈ لائیٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ٹکسالی گیٹ کے قریب واقع ہے۔ اس کی ابتدا انگریزوں کی آمد کے بعد ہوئی۔ انگریزوں نے مغلوں کے علاقے کو جسم فروشی کا اڈا بنا دیا۔ اس دور سے لے کر موجودہ حد تک یہ علاقہ اسی حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی کی بات ہے کہ جہاں کبھی مغلیہ دربار کے امراء وزرا کی حویلیاں اور عالی شان مکانات ہوا کرتے تھے۔ آج اس محلے کا نام بدنام

ہو گیا ہے۔ شریف لوگ اس جانب جانے سے گھبراتے ہیں۔ بہر حال یہ وہ علاقہ ہے جس کی راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔

> "جناب ہم بہت غلط جگہ پر کو منڈی کا آغاز کرنے لگے ہیں، یہ دائیں جانب لاہور کی ممنوعہ گلیاں ہیں جسے عرف عام میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے مجھ ایسا شریف شخص زبان پر نہیں لاسکتا لیکن نقل کفر والی بات ہے ان گلیوں کو ساجن کی گلیاں کہہ لیتے بلکہ ہیرا منڈی کہہ لیجئے۔"(۲۲)

غرض یہ کہ آج کے لاہور اور کل کے لاہور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کی آبادی تقریباً ۸ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جبکہ اب اس کی آبادی کروڑوں تک پہنچ چکی ہے لاہور ایک سست رو نو آبادیاتی شکل کا شہر تھا مال روڈ پر کچھ کچھ وقفہ کے بعد کار گزرتی تھی جبکہ اب کاروں کی نہ ختم ہونے والی زنجیر ہر وقت سڑک پر رہتی ہے۔ کل کے لاہور میں اندرون شہر کی اپنی ایک شناخت تھی شہر کے اندر کے لوگوں کا لب ولہجہ، رہن سہن اور کھانا پینا بیرون شہر کے لوگوں سے مختلف تھا۔ اندرون شہر کے لوگ بے تکلف خوش خوراک اور انسانی لب و لہجے کے حامل تھے جب لاہور میں نئی آبادیاں ہونا شروع ہوئیں تو لوگوں کے لب ولہجے سمیت طرز زندگی میں بھی تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ نئے شہر لاہور کے بارے میں اس نسل کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد بلوغت پائی تھی اور جنہوں نے لاہور کو سست رو شہر سے تیز رفتار شہر میں ڈھلتے دیکھا کیونکہ یہ طبقہ وہ ہیں جو دوسرے علاقوں سے نقل مکانی کر کے آئے ہیں یا اہل ثروت ہیں ان کا اسلوب زندگی عام لوگوں سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک لاہور کی معاصر تہذیب بے وضع ہو چکی ہے اور یہ ہر نئی بات نئے فیشن یا چیز کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیتی ہے اور اپنے نئے خدوخال وضع کرنے میں لگی ہوتی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود لاہور کے باسی لاہور کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں نہیں رہ سکتے، لاہوریوں کے لیے لاہور ایک نشہ ہے جس سے وہ باہر نکلنا نہیں چاہتے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۷۶
۲۔ انیس ناگی، لاہور جو شہر تھا (لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۴۔۱۵
۳۔ مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۷۲
۴۔ مستنصر حسین تارڑ، اے غزال شب، ص ۷۲
۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۶۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۱۴
۷۔ ایضاً، ص ۳۱۰
۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۹۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۱۰۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۰۹ء)، ص ۸۹
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ بانو قدسیہ، شہر بے مثال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۵۵
۱۳۔ ایضاً، ص ۵۵۔۵۶
۱۴۔ بانو قدسیہ، شہر بے مثال، ص ۱۰۴۔۱۰۵
۱۵۔ اے حمید، لاہور کی یادیں (لاہو: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۷۵
۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص ۱۲۴
۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۱۳۷
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۱
۱۹۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص ۲۴۴
۲۰۔ ایضاً، ص ۵
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۰
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۶